ڈاکٹر محمد حمیداللہؒ: مشاہدات و تاثرات

ظفر اسحاق انصاری ☆

ترجمہ: خورشید احمد ندیم☆☆

اس واقعے کو بیتے اٹھارہ برس ہوچکے ہیں۔ ایک سہ پہر میں اپنے ایک عزیز، محترم دوست اور معروف سعودی اسکالر جناب اسماعیل ابراہیم نواب کے ساتھ پیرس میں ایک فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کی اقامت گاہ تھی۔ گھنٹی بجی اور چند لمحے بعد گھر میں ایک بلب روشن ہوگیا۔ چند لمحے بعد ڈاکٹر حمیداللہ دروازے پر نمودار ہوئے۔ اس موقع پر ان سے جو گفتگو ہوئی، اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا لیکن اس دوران انہوں نے ایک ایسا جملہ کہا، جس کو میں ابتدا میں اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک اسے ان کے کسی بھی تذکرے کا مقدمہ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب کو انہی دنوں حکومت پاکستان نے دس لاکھ روپے کا ایک ایوارڈ دیا تھا، جو سیرت پاک پر ان کی علمی خدمات کا اعتراف تھا۔ انہوں نے یہ پوری رقم ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے نذر کر دی۔ میں نے اس خبر کی تصدیق چاہی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''آپ نے صحیح سنا''۔ پھر کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوئے ''اگر میں یہاں لے لیتا تو پھر وہاں کیا ملتا؟''۔

اٹھارہ برس کے بعد بھی یہ جملہ میری سماعت کے لیے تروتازہ ہے اور اس کی تازگی میں شاید کبھی فرق نہ آئے۔ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ ڈاکٹر حمیداللہ کون تھے، کیسے تھے!

ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کے ساتھ برسوں پر محیط یادوں کا جب میں احاطہ کرتا ہوں تو یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء کے موسم گرما سے جا ملتا ہے جب میں پہلی مرتبہ ان سے براہ راست متعارف ہوا تھا۔ قیام پاکستان کو ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا۔ یہ مملکت چونکہ اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی، اس لیے بعض اصحاب کی ترجیحات میں ان اصولوں اور خصوصیات کا تعین سرفہرست تھا جو ایک نومولود اسلامی ریاست کے لیے نظریاتی بنیادیں فراہم کر سکیں۔ اس ضمن میں تین اصحاب مولانا شبیر احمد عثمانی (م۱۹۴۹ء)، مولانا احتشام الحق تھانوی (م۱۹۸۰ء) اور میرے والد محترم محمد ظفر احمد انصاری (م۱۹۹۱ء) نے ابتدائی

☆ ڈائریکٹر جنرل، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قدم اٹھایا اور اس مسئلے پر غور وفکر کے لیے بعض اصحاب علم وفضل کو کراچی میں جمع کیا۔ میری یادداشت کے مطابق جن حضرات نے اس دعوت کو قبول کیا وہ تھے مولانا مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶ء)، ڈاکٹر محمد حمیداللہ (م۲۰۰۲ء)، اور ایک نسبتاً کم معروف شخصیت جناب غلام دستگیر رشید۔ موخرالذکر ''اسلامی تہذیب کیا ہے؟'' کے مرتب تھے جو ان دنوں خاصی مقبول تھی۔ ان تینوں شخصیات کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا۔ میرے ذہن میں ان تین حضرات ہی کے نام محفوظ تھے، برادرم ڈاکٹر محمود احمد غازی اور ڈاکٹر محمد الغزالی نے اس فہرست میں ایک اور صاحب علم کا اضافہ کیا ہے۔ یہ بھارت سے تشریف لانے والے مولانا احتشام الحسن صاحب کاندہلوی تھے۔ یہ حضرات اپریل ۱۹۴۸ء میں کراچی میں جمع ہوئے۔

میری معلومات کی حد تک، اس منصوبے کے اخراجات، جنوبی افریقہ میں آباد میاں خاندان نے اٹھائے جو متمول بھی تھے اور اسلامی کاموں میں بہت پرجوش اور سرگرم بھی۔ سورت (بھارت) سے تعلق رکھنے والے اس تاجر خاندان نے، جو جنوبی افریقہ میں اپنا کاروبار مستحکم کر چکا تھا، ان دنوں کراچی میں کاروباری وسعت کے امکانات تلاش کر رہا تھا۔ کم و بیش چھ سات افراد کے اس گروپ نے تقریباً دو ہفتوں تک اپنی مشاورت جاری رکھی۔ میری ویدر ٹاور کے سامنے ایک بڑا فلیٹ، جسے میاں فیملی نے کچھ ہی پہلے خریدا تھا ان سرگرمیوں کا مرکز تھا، یہ جگہ اسی خاندان کی قائم کردہ شاندار مجلس علمی لائبریری کے لیے برسوں زیر استعمال رہی۔

مجھ جیسے کسی نوعمر کے لیے تو اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ وہ ان مجالس میں شریک ہوتا یا یہ جان پاتا کہ کیا باتیں زیربحث ہیں، تاہم کبھی کبھی گفتگو کا کوئی حصہ یا کسی کا تبصرہ سماعت سے ٹکرا جاتا۔ اس اجتماع کے ایک منتظم کے بیٹے کی حیثیت سے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے میں اس مجلس میں آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے کچھ کم باعث فخر نہ تھی کہ اس طرح میں ان عظیم المرتبت شخصیات کی چند جھلکیاں اپنے دل و نگاہ میں محفوظ کر سکا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس موقع پر مولانا مناظر احسن گیلانی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ایک عالم کی حیثیت سے ان کا جو مقام و مرتبہ تھا وہ کسے نہیں معلوم، اس کے علاوہ مجھے ان کی شخصیت میں سادگی، وقار اور حس مزاح کا ایک بڑا دل کش امتزاج نظر آیا۔ اسی طرح ڈاکٹر حمیداللہ کے تواضع، انکسار اور عاجزی طبع نے بھی مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب ایک ابھرتے ہوئے اسکالر کے طور پر برصغیر میں متعارف ہو رہے تھے۔ میں اپنے والد صاحب کے پاس ان کی تصنیف The Muslim Conduct of State دیکھ چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس زمانے میں اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ

جان کر کہ فنی اور علمی اعتبار سے یہ میرے معیار فہم سے بلند ہے، ایک بھاری پتھر سمجھ کر اسے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ تاہم کتاب کے محققانہ انداز نے میرے ذہن پر گہرا نقش چھوڑا۔ چند سال بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتاب ٹھوس تحقیق پر مبنی ہے اور اس سے ایک اہم علمی میدان -اسلامی بین الاقوامی قانون- میں نئے افق سامنے آتے ہیں۔

یہ مجالس جن کا میں نے ذکر کیا، دس بارہ دن سے زیادہ جاری نہ رہ سکیں۔ میں یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیوں ختم ہوگئیں۔ شاید اس کا سبب حیدرآباد پر منڈلانے والے وہ خطرات تھے جن کے باعث سرحد پار سے آئے ہوئے شرکاء واپس جانے پر مجبور ہوئے، اب یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ حیدر آباد دکن کی ریاست چند ماہ بعد ہی ہندوستان کی توسیع پسندی کا شکار ہوگئی۔

ان مجالس کے انعقاد کے سلسلے میں میرے علم کی حد تک اخبارات میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی اور میرا گمان ہے کہ یہ بات دانستہ تھی۔ اس کا غالباً ایک بڑا سبب یہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا، وہ ٹھوس علمی و فکری نتائج کے متمنی تھے ان کے پیش نظر اس سے کوئی سیاسی فائدہ اٹھانا نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس بات کا اخبارات میں چھپنا ان مہمانوں کے لیے پریشانی کا باعث ہوسکتا تھا اس لئے ہندوستان کا پریس اس بات کو اچھال سکتا تھا کہ یہ حضرات پاکستان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام میں عملی معاونت کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج یہ بات شاید ہی کسی کے علم میں ہو کہ اس نوعیت کی کوئی کاوش کبھی ہوئی بھی تھی۔

ان مجالس کی کوئی رپورٹ یا سفارشات تو سامنے نہ آسکیں لیکن اس کے باوجود یہ کوشش فائدے سے خالی نہ تھی۔ پاکستان کی اسلامی تشکیل کی مہم میں مصروف حضرات کو متعلقہ امور میں غور و فکر اور تبادلہ خیال، ان کی حقیقت پسندی میں اضافہ کا موجب ثابت ہوئے ہوں گے اور انہیں اس بات کا اندازہ ہوا ہوگا کہ بیسویں صدی میں اسلامی ریاست کی تشکیل کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ امویوں، عباسیوں یا عثمانیوں کے قائم کردہ ریاستی اداروں کی کورانہ خوشہ چینی کرتے ہوئے انہیں من و عن نافذ کر دیا جائے۔ بلکہ یہ کام تحقیقی اور اجتہادی بصیرت کا متقاضی ہے۔ اس ابتدائی کاوش کا یہ نتیجہ تو سامنے نہیں آیا کہ یہ حضرات اسلامی ریاست کی تشکیل کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات سامنے لا سکے ہوں لیکن یہ ضرور ہوا کہ وہ سوالات نکھر کر سامنے آگئے جو اس مقصد کے لیے بہرطور جواب طلب تھے۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ یہ ابتدائی کاوش بعد میں بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے کام میں ممد ثابت ہوئی ہو جو ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اسلامی ریاست

کے ان ۲۲ بنیادی نکات کے تعین میں اس نے کوئی کردار ادا کیا ہو جو ۱۹۵۱ء میں تمام مکاتب فکر کے اکتیس علماء نے متفقہ طور پر منظور کیے۔ ان نکات پر اتفاق رائے اسلامی ریاست کی تشکیل کی طرف بلاشبہ ایک غیر معمولی پیش رفت تھی۔

ان مجالس کے چند ہی ماہ بعد ڈاکٹر حمیداللہ کا ذکر اس وقت ایک بار پھر سننے میں آیا جب حیدرآباد کے آزادانہ تشخص کو درپیش خطرات مزید ابھر کر سامنے آئے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر حمیداللہ حیدرآباد کے سرکاری وفد کے ایک رکن مقرر ہوئے ہیں جو براستہ کراچی، غیر ملکی دورے پر جا رہا ہے۔ اس وفد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ عالمی رائے عامہ کو بھارت کی امکانی جارحیت کے خلاف بیدار کرے اور آزادی سے محبت رکھنے والی اقوام کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ حیدرآباد پر قبضے کے سوچے سمجھے بھارتی منصوبے کے خلاف آواز اٹھائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کراچی کے اجلاس میں شرکت کے بعد ڈاکٹر حمیداللہ واپس حیدرآباد چلے گئے اور چند ماہ کے بعد پھر کراچی واپس آ کر بیرونی ممالک کے دورے پر روانہ ہوگئے۔

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

۱۹۴۹-۱۹۵۰ء میں جب ڈاکٹر حمیداللہ نے ایک سال کراچی میں قیام فرمایا تو مجھے ان سے ملنے جلنے کے متعدد مواقع ملے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۴۹ء میں بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے ممبر کی حیثیت سے کراچی تشریف لائے تھے۔ یہ بورڈ حکومت پاکستان نے تشکیل دیا تھا اور اس کا کام اسلامی آئین کی تشکیل میں دستور ساز اسمبلی کی معاونت کرنا تھا۔ اس بار وہ پیرس سے تشریف لائے تھے۔ پیرس میں وہ تیس کی دہائی میں بھی اپنے دور طالب علمی میں کئی سال تک قیام کر چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب بھارت نے حیدرآباد کو اپنا حصہ بنا لیا تو اس وقت ڈاکٹر صاحب پیرس میں ہی تھے اور انہوں نے پیرس میں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

بورڈ تعلیمات اسلامیہ مندرجہ ذیل شخصیات پر مشتمل تھا۔

۱۔ علامہ سیّد سلیمان ندوی (م۱۹۵۳ء) چیئرمین
۲۔ مولانا مفتی محمد شفیع (م۱۹۷۶ء)
۳۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ
۴۔ پروفیسر محمد عبدالخالق
۵۔ مفتی جعفر حسین مجتہد(م۱۹۸۳ء)

۶۔ میرے والد، محمد ظفر احمد انصاری بورڈ کے سیکرٹری تھے۔

ہم ان دنوں کراچی کے ایک معروف مقام سعید منزل کے سامنے رہتے تھے۔ یہ بندر روڈ پر ایک دومنزلہ عمارت کا ایک فلیٹ تھا جس کا نمبر ۱۲/۱۸ تھا۔ یہ سڑک اب ایم اے جناح روڈ کہلاتی ہے۔ گھر سے دستور ساز اسمبلی کی عمارت تک، جہاں بورڈ کا دفتر واقع تھا دس بارہ منٹ کا پیدل راستہ تھا۔ میں اپنے والد سے ملنے وقتاً فوقتاً وہاں جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر حمیداللہ کا انکسار، ان کا فطری تواضع، ان کی ایسی خوبیاں تھیں کہ ان سے ملنے جلنے والوں کے لئے ان سے بے خبر رہنا ممکن نہ تھا بلکہ ان کی یہ خوبیاں ان سے متعارف ہونے والوں کو ان کا گرویدہ بنا لیتی تھیں۔ تاہم میرا ان سے رابطہ بڑی حد تک سلام دعا تک محدود رہا۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا اور شاید اتنی خوداعتمادی مجھ میں نہ تھی کہ میں ان سے کسی اہم علمی مسئلے پر گفتگو کی جسارت کرتا۔ جہاں تک ڈاکٹر حمیداللہ کا تعلق ہے تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی فطرتاً ایک کم گو انسان ہیں اور لوگوں کے ساتھ اختلاط کے معاملے میں کسی پیش قدمی کا میلان نہیں رکھتے۔ چنانچہ میں نے انہیں بہت کم گفتگو کرتے دیکھا الا یہ کہ ان سے کوئی سوال کرے۔ تاہم جب بھی انہوں نے گفتگو کی، میں ان کی نپی تلی، ذمہ دارانہ اور متواضع گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ ان کی نرمیٔ طبع اور شائستگی ان پر مستزاد تھے۔ ان کی یہ سادہ طبعی مجھ پر اس وقت پوری طرح واضح ہوئی جب ایک سوال کے جواب میں انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ خداداد کالونی سے بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے دفتر تک روزانہ پیدل چل کر آتے ہیں۔ وہ اس کالونی میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کالونی سے بورڈ کے دفتر تک کا فاصلہ تقریباً تین میل ہوگا۔

ان دنوں میں اسلامیہ کالج کراچی کا طالب علم تھا۔ ۱۹۴۹ء کے پہلے ٹرم میں ڈاکٹر صاحب ہمارے کالج تشریف لائے اور انہوں نے ''اسلامی بین الاقوامی قانون'' کے موضوع پر لیکچر دیا۔ ان کے پاس تحریری نوٹس نہیں تھے، اس کے باوجود ان کا لیکچر بہت منضبط، منظم، معلومات افزا اور فکر انگیز تھا۔ تاہم ان کا لہجہ مدھم تھا اور لیکچر کے دوران انہوں نے شاید ہی حاضرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں دیکھا ہو۔ ہر اعتبار سے یہ ایک نہایت عمدہ لیکچر تھا جو ہر طرح کے تصنع، اداکاری اور سطحی خطابت سے پاک تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس لیکچر میں بھرپور دلائل کے ساتھ یہ بات کہی کہ بین الاقوامی قانون دراصل مسلمان فقہاء کی علمی و فکری کاوش کا نتیجہ ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے ڈاکٹر صاحب نے اس لیکچر میں بین الاقوامی قانون کے لیے international law کے بجائے inter-statal law کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ بین الاقوامی قانون کے اصولوں کی تشکیل کے سلسلے

میں بطور بانی، امام محمد ابن الحسن الشیبانی (م۸۰۵ء) کا نام ۱۹۴۹ء کی خزاں کے آخری دنوں سے میرے ذہن پر نقش ہے جب میں نے ڈاکٹر صاحب کا یہ لیکچر سنا تھا۔

بطور رکن بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ، کراچی میں ایک سال گزارنے کے بعد ڈاکٹر حمیداللہ واپس پیرس چلے گئے۔ ان کی روانگی پر ان کے احباب رنجیدہ اور کبیدہ خاطر تھے۔ اس بات نے ہمیں مزید اداس کر دیا کہ وہ یہاں کچھ خوش نہ تھے، اور ان کی واپسی کا ایک سبب ان کی بے اطمینانی تھی۔ شاید وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ بورڈ کا کام کماحقہ نتیجہ خیز نہیں ہے۔ شاید پیرس کی شاندار لائبریریوں اور اپنے اصل کام، درس و تدریس اور تحقیق، سے دوری انہیں گراں گزرنے لگی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا مزاج ایک ایسے ماحول میں کام کرنے پر آمادہ نہ ہو جہاں یہ بات پوری طرح واضح نہ ہو کہ ہر متعلقہ شخص کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ شاید وہ پاکستان کے ارباب حل و عقد کے بارے میں کوئی ذہنی تحفظ رکھتے ہوں، یا شاید وہ یہ بھی خیال کرتے ہوں کہ دستور ساز اسمبلی کے لیے بورڈ کی سفارشات پر عمل درآمد کو لازم قرار دیا جانا چاہیے جبکہ اس کی حیثیت مشاورتی تھی۔ میں اس بارے میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں جانتا، سوائے اس کے کہ وہ غیر مطمئن تھے اور انہوں نے اسی بناء پر پیرس واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اپنے والد صاحب سے اس بارے میں کچھ پوچھا ہو یا انہوں نے خود اپنے طور پر مجھے کوئی خاص بات بتائی ہو۔ اپنے مزاج کے عین مطابق، ڈاکٹر حمیداللہ ان چیزوں کے بارے میں کوئی شور و ہنگامہ کیے بغیر یہاں سے رخصت ہوگئے۔

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

کراچی کے بعد ان سے میری اگلی ملاقات پیرس میں ہوئی اور ان ملاقاتوں کے درمیان چھ سال کا وقفہ ہے۔ ان کے بہت سے مداحوں کی طرح ان کا پتہ 4 rue de Tournon, Paris VI نہ صرف میری نوٹ بک میں درج تھا بلکہ میرے ذہن پر بھی نقش تھا۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں اپنے ایک دوست محمد حسن صاحب کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں مونٹریال جا رہا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے پیرس میں رکنے کا فیصلہ کیا۔ میں بلامبالغہ یہ عرض کرتا ہوں کہ یہاں رکنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اپنے عہد کی اس عظیم صاحب علم شخصیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ ان دنوں الجزائر کی تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ آج میرے لیے سامراجیت کے خلاف ان شدید احساسات کو ان کی پوری شدت کے ساتھ یاد کرنا آسان نہیں جو سینتالیس برس پہلے میرے اور دوسرے نوجوانوں کے دلوں میں موجزن تھے۔ پاکستان میں فرانس کے بائیکاٹ کی مہم بھی اپنے عروج

پر تھی۔ پیرس کے ہوائی مستقر پر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کسی ایسے ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے جو کسی فرانسیسی کی ملکیت ہو۔ گویا ہم نے یہ طے کیا کہ ہم پیرس میں بھی فرانس کا بائیکاٹ کریں گے! جوانی کے جوش میں ہم نے ''میزبان پیرس'' سے کہا کہ ہم کسی الجزائری ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ (میزبان پیرس ایک دفتر ہے جو رہائشی مسائل میں سیاحوں کی معاونت کرتا ہے)۔ جب کاونٹر پر بیٹھی لڑکی نے یہ کہا کہ وہ یہ نہیں جانتی کہ کون سا ہوٹل الجزائری ہے اور کون سا غیر الجزائری تو ہم نے سوچا کہ وہ یا تو ہم سے مذاق کر رہی ہے یا جھوٹ بول رہی ہے۔ بہرحال ہم نے پیرس کے سستے ہوٹلوں کی فہرست پر نظر ڈالی اور ہوٹل ڈی گرینیڈے (Hotel de Grenade) کا انتخاب کیا۔ کم سے کم اس کے نام میں تو اسلامیت کی جھلک تھی!

ہوٹل جاتے ہوئے ہم ڈاکٹر حمیداللہ کے گھر کے قریب رکے۔ خوش قسمتی سے وہ اسی وقت اس قدیم عمارت میں داخل ہو رہے تھے جس کے ایک فلیٹ میں ان کی رہائش تھی۔ وہ اپنے مخصوص سادہ انداز میں فرنچ روٹی کا تھیلا اٹھائے ہوئے تھے۔ تازہ روٹی کی خوش بو ہماری بھوک کو تیز کر رہی تھی۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہوں گے اور دن بھر کے کام کے بعد ڈاکٹر صاحب کسی قدر تھکے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے کشادہ پیشانی اور بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم اس وقت اپنے ہوٹل جا رہے ہیں اور کچھ دیر تازہ دم ہونے کے بعد شام کا کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ ان کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا اور انہوں نے خوشی سے آمادگی ظاہر کر دی۔ جلد ہی ہم ہوٹل جا کر واپس آ گئے اور کئی منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر ان کے سادہ سے فلیٹ تک پہنچ گئے جسے ہمارے لیے پیرس میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ 4 rue de Tournon۔

ہم نے کچھ وقت ڈاکٹر حمیداللہ کے فلیٹ میں اِدھر اُدھر کی گفتگو میں گزارا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتایا کہ فرانس میں اسلام ایک مناسب رفتار سے پھیل رہا ہے اور لوگوں کی ایک معقول تعداد اپنی روحانی تسکین کے لیے اس کے دامن میں پناہ لے رہی ہے۔ ہماری تجویز پر ڈاکٹر صاحب ہمارے ساتھ ایک ریستوران تک آئے، جس کا نام شاید الحمرا تھا۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ ریستوران لیٹن کوارٹر میں تھا۔ ریستوران میں چونکہ حلال گوشت میسر نہیں تھا اس لیے ہم نے گوشت کے بغیر ہی گزارا کیا۔ جب ہم نے بل ادا کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی یہ کام کر چکے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ ہماری خواہش کے سراسر خلاف تھا اور ہمارے لیے قدرے باعث شرمندگی بھی۔ جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ کشادہ

دلی اور مہمان نوازی اُن کے نمایاں ترین اوصاف تھے۔

کھانا ختم ہوگیا لیکن ہم کچھ دیر مزید ان کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ الجزائری تحریک آزادی سے گہری دل چسپی کے باعث ہم ان کے ساتھ الجزائری مسلم سٹوڈنٹس ایسوی ایشن کے دفتر گئے۔ وہاں ہماری ملاقات جناب محمد خمسیتی مرحوم سے ہوئی جو اس تنظیم کے سیکرٹری جنرل تھے۔ چند سال بعد جب الجزائر آزاد ہوا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے اہم لوگ تھے! جس آدمی نے بڑے حلم اور تواضع کے ساتھ ہم سے کم و بیش ایک گھنٹہ گفتگو کی تھی وہ آزاد الجزائر کا پہلا وزیر خارجہ تھا۔

اگلے دن جمعہ تھا اور ہم ناشتے کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کے گھر جا پہنچے۔ گزشتہ شب جب ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا تو ڈاکٹر صاحب نے کمال عنایت سے یہ پیشکش کی تھی کہ نماز جمعہ کے لیے وہ ہمیں پیرس کی جامع مسجد اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ جب ہم ان کے ہاں پہنچے تو وہ ایک فرانسیسی خاتون کو اسلام کی تعلیم دے رہے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب نے ایک دینی بہن کہہ کر ہمیں ان خاتون سے متعارف کرایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔

جب خاتون کا سبق ختم ہوا تو ڈاکٹر صاحب ہم سے مخاطب ہوئے۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں گزشتہ رات کو ٹوٹا تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ گزشتہ ایام میں اسلام قبول کرنے والے لوگوں کی تعداد میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے اور عورتوں میں یہ رجحان قدرے زیادہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ فرانس کی بعض خواتین، جن میں ایک دو وہ بھی تھیں جن کو ملکہ حسن کا اعزاز حاصل ہو چکا تھا، کچھ ہی عرصہ قبل مشرف بہ اسلام ہوئی ہیں۔ گفتگو درمیان میں تھی کہ نماز جمعہ کا وقت قریب آ گیا اور ہم پیرس جامع مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسجد تک جانے کے لیے زیر زمین ٹرین کا انتخاب کیا۔ میں اور محمد حسن صاحب پہلی مرتبہ زیر زمین ٹرین کا سفر کر رہے تھے، جس نے اس سفر کو ہمارے لئے مزید یادگار بنا دیا۔

جب ہم مسجد پہنچے تو وہ ہمیں بہت دل کش محسوس ہوئی۔ مسجد کا اندلسی طرزِ تعمیر اس کے شکوہ اور حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تصور کہ ہم یورپ کے ایک نہایت مرکزی اور تاریخی اہمیت کے شہر میں جمعہ کی نماز ادا کر رہے ہیں ایک عجیب طرح کے روحانی کیف اور دلی مسرت کا باعث تھا۔

میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ گزشتہ رات ہم الحمرا ریستوران میں ڈاکٹر صاحب کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے ریستوران کے مالک سے ذبیحہ گوشت کے

بارے میں پوچھا تھا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں ریستوران کے کاروبار کو اس کا سبب قرار دیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ گزشتہ پچیس برسوں میں ہم پہلے گاہک ہیں جنہوں نے ذبیحہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نے ہمیں اگلے دن یعنی جمعہ کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ وہ خاص طور پر مویشی فارم جائے گا اور ہمارے لیے ایک بھیڑ ذبح کروا کر لائے گا۔ جمعہ کی نماز کے بعد جب ہم ریستوران پہنچے تو ہمیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اس نے ہمارے لیے شمالی افریقہ کا ایک لذیذ کھانا تیار کر رکھا ہے۔ ہم نے کئی دنوں سے گوشت نہیں کھایا تھا، اس لیے اس روز ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور کھانے کے ساتھ ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کی صحبت سے بھی پوری طرح مستفید ہوئے۔

اسی روز شام کے وقت ہم ڈاکٹر حمیداللہ کو خداحافظ اور پیرس کو الوداع کہہ رہے تھے۔ اس وقت ہمیں اس بات کا ذرہ برابر افسوس نہ تھا کہ ہم نے اس غیرمعمولی حسین شہر کے تاریخی اور دوسرے اہم مقامات کی تقریباً مطلق سیر نہیں کی تھی۔ اس ملاقات کی یادوں نے عرصے تک ہمیں مسحور کیے رکھا۔ ہم اس بات پر بے حد خوش تھے کہ اگرچہ سیر سپاٹا تو نہ ہوسکا لیکن ایک نادر اور یگانہ روز شخصیت کے ساتھ ہم نے کافی وقت قرب و بے تکلفی کی فضا میں گزارا۔

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

ڈاکٹر حمیداللہ سے چند یادگار ملاقاتیں ۱۹۷۴ء میں ظہران اور الخبر میں ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب سعودی حکومت کی دعوت پر سعودی عرب تشریف لائے تھے۔ میں ان دنوں ظہران میں ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا، جو آج کل ''کنگ فہد یونیورسٹی آف پٹرولیم اینڈ منرلز'' کہلاتی ہے۔ اس سفر میں ڈاکٹر صاحب نے ہماری یونیورسٹی سمیت کئی تعلیمی اداروں میں لیکچر دیئے۔ مجھے یہ جان کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ ٦٦ برس کی عمر میں بھی وہ جزیرہ نمائے عرب کے بارے میں اپنی فیلڈ ریسرچ میں حسب سابق مشغول تھے اور ان میں اب بھی وہی گرم جوشی اور توانائی موجود تھی، جس کا مظاہرہ انہوں نے تیس بتیس سال کی عمر میں کیا تھا۔ ان کی نوجوانی کی عمر میں اس محنت شاقہ کا ثمرہ ''رسول اکرم کے میدانِ جنگ'' نامی کتاب ہے۔

ایک جمعرات کی صبح قطیف کے سفر میں جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔ قطیف نامی شہر کا میئر اپنے دفتر میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ روانگی سے قبل ڈاکٹر صاحب نے اپنے سفر کے مقاصد کے بارے میں ہم سب سے اچھی خاصی گفتگو فرمائی تھی۔ قطیف کے اس سفر کا اصل

مقصد ایک چھوٹی بستی زارہ کا دورہ تھا جو قطیف سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ (یہ ایک دوسرے اور نسبتاً زیادہ مشہور گاؤں عوّامیہ سے تقریباً ملحق ہے)۔ ڈاکٹر حمیداللہ اپنی برسر زمین تحقیق کے لیے علمی طور پر پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اپنی بعثت سے پہلے جب حضور رسالت مآب ﷺ تجارت میں مصروف تھے تو آپ نے جزیرۃ العرب کے مشرقی حصہ بالخصوص اس کے ساحلی علاقوں کے تجارتی سفر کیے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ اور تحقیق کی رو سے چھٹی اور ساتویں صدی میں یہاں تجارتی میلے کثرت سے منعقد ہوتے تھے۔ ان میلوں کا زمانہ کچھ اس طرح مقرر کیا گیا تھا کہ بغیر کسی قابل ذکر انقطاع کے یہ وقفہ وقفہ سے کم و بیش سال بھر منعقد ہوتے رہتے تھے۔ ان امور پر انہوں نے ۱۹۷۴ء میں جو کچھ فرمایا تھا، اس کا بڑا حصہ میری یادداشت میں آج بھی تازہ ہے اور میں اس کا بڑا حصہ بشمول ان حوالہ جات کے، جو انہوں نے اہم کتب سے دیئے تھے، سنا سکتا ہوں۔ (اس سے ان کی تدریسی صلاحیتوں کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے)۔ اس موقع پر انہوں نے اس روایت کا خاص طور پر ذکر فرمایا تھا جس میں رسالت مآب ﷺ نے زارہ کے چشمہ کے پاس اپنے قیام کا ذکر فرمایا ہے۔ (حوالے کے لیے دیکھیے، مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر ۱۷۱۶۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربیہ، ۱۹۹۱ء)۔ اس خطے کے جغرافیہ اور تاریخ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کو بے شمار تفصیلات ازبر تھیں۔

میئر کے دفتر میں چند منٹ میں نقشوں کی مدد سے زارہ کو شناخت کر لیا گیا، بلکہ اس موقع پر وہاں کئی ایسے مقامی لوگ موجود تھے جنہیں زارہ تک جانے کے لیے کسی نقشے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چند لمحوں کے بعد ہم قطیف کے میئر کے ساتھ اس چشمے پر کھڑے تھے جہاں چودہ سو سال پہلے رسول اکرم ﷺ کے قدم مبارک پڑے تھے۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا جو دل کے نہاں خانے میں ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ چشمے کے پاس ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی، جسے عثمانی ترکوں نے تعمیر کیا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر حمیداللہ تاریخی اہمیت کے حامل دیگر مقامات پر بھی تشریف لے گئے جن کے بارے میں وہ پہلے ہی سے وسیع معلومات رکھتے تھے۔ یونیورسٹی میں اپنی تدریسی مصروفیات کے باعث میں دوسرے مقامات کے سفر میں ان کے ساتھ نہ جا سکا اگرچہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ایسے ہر سفر میں ان کا ہم سفر ہوتا۔ یہ میرے لیے عزت کی بات ہوتی اور میں اس طرح بہت کچھ سیکھتا۔ میں ڈاکٹر حمیداللہ کے تبحر علمی، اُن کی تاریخی اور جغرافیائی معلومات سے ناواقف نہ تھا۔ تاہم ان کی معلومات کی گہرائی اور وسعت میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ ڈاکٹر حمیداللہ صاحب میں جو چیز بہت نمایاں تھی وہ رسالت مآب ﷺ کی ذات مبارک سے ان کی والہانہ محبت تھی۔ اگرچہ ان کی

محبت میں کسی تیز رو دریا کے شور کی جگہ سمندر کا پروقار سکوت تھا۔ یہ اللہ کے رسول کے ساتھ ان کی وہ عقیدت تھی جو انہیں عمر کے بڑے حصے میں وادی وادی قریہ قریہ اور کوبکو لیے پھرتی رہی۔

☆☆☆ ☆☆☆ ☆☆☆

اس ملاقات سے گیارہ برس بعد ۱۹۸۵ء میں مجھے اپنے ایک عزیز دوست اسماعیل ابراہیم نواب کے ساتھ یونیسکو کی ایک میٹنگ کے سلسلے میں پیرس جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے علم و فضل اور تقویٰ کے باعث، ہم دونوں ہی ان کے یکساں عقیدت مند ہیں۔ ہم دونوں کا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا خصوصی سایہ تھا۔ ایک سہ پہر ہم دونوں ان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس ملاقات کا میں اپنے مضمون کے آغاز میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس موقع پر ہم نے کم و بیش ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا اور مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کی۔

اس یادگار ملاقات میں، میرے دوست اسماعیل نواب نے ڈاکٹر صاحب کے سفر حجاز کا ذکر کیا، جب وہ کافی کم عمری میں بیت اللہ کے سایے میں اس جلیل القدر شخصیت سے ملے تھے۔ یہ چالیسویں دھائی کے آخری سالوں کی بات تھی۔ اسماعیل نواب نے یاد دلایا کہ وہ اس وقت بھی مختلف زبانوں پر ان کی دسترس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر حیدر آباد دکن کے ایک قافلہ حج کے ساتھ بطور امیر قافلہ حجاز تشریف لے گئے تھے۔ بیت اللہ کی اس ملاقات میں اسماعیل نواب نے ان سے دو موضوعات پر خاص طور گفتگو کی تھی، جو ان دنوں ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی کام کا خصوصی موضوع تھے، یعنی قرآن مجید کے مختلف زبانوں میں ترجمے اور مدینہ منورہ کے تاریخی مقامات، بالخصوص نبی ﷺ کے میدان ہائے جنگ۔

پیرس کی اسی ملاقات میں میں نے ان سے حکومت پاکستان کے ایوارڈ کے بارے میں دریافت کیا جو چند ہفتہ قبل ہی ان کو ملا تھا۔ اس پر انہوں نے جو جواب دیا اس کا تذکرہ میں ابتدا میں کر چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب واقعہ یہ ہے کہ ہم کو مبہوت کر دینے والا تھا۔ سادہ سے الفاظ میں کہی گئی یہ بات، شدت اخلاص کا مظہر تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ الفاظ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔

اگر ہم ڈاکٹر حمیداللہ کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں اور اس کو سمجھنا چاہیں تو اس کی کنجی ڈاکٹر صاحب کا یہ اہم جملہ ہے: ''اگر میں یہاں لے لیتا تو پھر وہاں کیا ملتا؟''

ڈاکٹر صاحب کے پورے علمی کام کو کھنگال جایئے،لیکن شاید اپنی جلالت شان کے باوجود اس میں ہمیں ان کی اصل شخصیت کا راز نہ مل سکے۔ نہ ان کے فرانسیسی ترجمہ قرآن میں، جس کے دسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ نہ سیرت رسول پر اُن کی گراں قدرنگارشات میں، جس کا اعلیٰ ترین نمونہ ان کی فرانسیسی تصنیف le prophet de l'islam ہے، نہ ان کے غیرمعمولی اور تاریخی علمی کام میں (جیسے البلاذری کی انساب الاشراف، جسے انہوں نے مدون کیا یا الوثائق السیاسیۃ، جو عہد رسالت اور دور خلافت راشدہ کے سیاسی دستاویزات کا ایک عظیم الشان مجموعہ ہے اور جس پر انہوں نے اپنی بے پناہ توانائی صرف کی تھی)۔ اسی طرح یہ راز ہمیں اسلامی بین الاقوامی قانون پر ان کی عہدساز تصنیف The Muslim Conduct of State میں بھی نہیں ملے گا۔ یہ راز اگر بند ہے تو اس جملے میں جو اس ملاقات میں انہوں نے کہا تھا اور جو ان کی شخصیت ان کے محیر العقل کام اور اس کی برکت کا اصل عنوان ہے۔ اب ہم بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے ترجمہ قرآن کو غیرمعمولی پذیرائی کیوں حاصل ہوئی، ان کی کتب سیرت کیوں اس درجہ مقبول ہوئیں، اور یہ کیسے ہوا کہ ان کا وجود بے شمار انسانوں کے لیے، جن میں مسلمان بھی تھے اور غیرمسلم بھی، مینارہ نور بن گیا۔ اس تاریخی جملے کے بعد ڈاکٹر حمیداللہ ہمارے لیے کوئی معمہ نہ رہے تھے!